

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

یہ سن باسٹھ کی بات ہے۔ میں ایک ضروری کام سے اپنے بڑے بھائی شاہ محمد نجم الدین صاحب کے پاس جو ان دنوں ڈپٹی رجسٹرار تھے، جامعہ کراچی گیا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولے "چلو آرٹس سیکشن چلتے ہیں۔ وہاں سیرت النبیؐ کا جلسہ ہے۔ پھر گھر چل کر باتیں کریں گے۔" میں ان کے ہمراہ جلسہ گاہ میں پہنچا۔ اس وقت ڈاکٹر ایم، ایم احمد مرحوم اپنے منفرد انداز میں سیرت کے کسی پہلو پر تقریر کر رہے تھے۔ ان کے بعد اسٹیج سیکرٹری نے وائس چانسلر کو سیرت النبیؐ پر روشنی ڈالنے کی دعوت دی۔ ہلکے سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس، اچھی شکل و صورت کے ایک شخص، آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک لگائے، نہایت باوقار انداز میں مائک تک آئے اور پھر ..... وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا سماں بندھ گیا۔ وہ صاحب آنحضرتؐ کی سیرت پاک پر اس دلنشیں انداز میں تقریر کر رہے تھے کہ ہر بات دل میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ سرکارؐ کے اوصاف حمیدہ یوں بیان کیئے جا رہے تھے کہ بہتوں کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اندازِ تخاطب میں نہ جوش تھا نہ ولولہ، نہ شور تھا نہ شرابہ، بس دھیما دھیما سا، ٹھہرا ٹھہرا سا رنگِ تکلم تھا جس میں علم کی گہرائی، تاریخ کی وسعت، جذبۂ ایمانی کی جھلک، احترام و تقدس کا شائبہ اور عقیدت والفت کا اظہار نمایاں تھا۔

یہ مقرر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ کیمبرج کے فارغ التحصیل، اسٹیفن کالج دہلی کے استاد، عدم تعاون کی تحریک کے رکن، خلافت تحریک کے سرگرم کارکن، ہسٹاریکل ریکارڈ کمیٹی (پاک و ہند) کے ممبر، مسلم لیگ کی تعلیمی کمیٹی کے رکن اعلیٰ، پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر، سابق وزیر تعلیم، وزیر مہاجرین و بحالیات اور وزیر اطلاعات و نشریات، کولمبیا یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر، ادارہ تحقیقات اسلامی کے ناظم، جامعہ کراچی کے وائس چانسلر، مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں، اکادمی ادبیات پاکستان کے بانی اور نامور مورّخ، ادیب اور ماہر تعلیم! اس دن میں نے پہلی مرتبہ انہیں

دیکھا سُنا اور ان سے متاثر ہوا ـــ بات آئی گئی ہوگئی۔

برسوں بعد جب ۱۹۶۹ء میں میرے کرم فرما ابنِ انشاء نے نیشنل بک سنٹر کے ماہنامہ "کتاب" میں کراچی کے اشاعتی اداروں کے عنوان سے سلسلۂ مضامین شروع کرنے کی ہدایت کی تو میں نے سب سے پہلے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ پر مضمون لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے سربراہ میجر آفتاب حسن تھے جو میرے قدیم محسن ہی نہیں، میرے بزرگوں کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ میں نے فون کرکے اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے حسب معمول مشفقانہ لہجے میں جواب دیا کہ "بس آجاؤ، ضروری مواد مل جائے گا" چنانچہ میں یونیورسٹی کیمپس پہنچا اور جرائد، رسائل اور کتب کا انبوہِ گراں ایک ٹیکسی میں لاد کر بہار کالونی واپس آیا۔ یہ کتابیں زیادہ تر اصطلاحات پر تھیں۔ کچھ انگریزی کتب کے ترجمے بھی تھے۔ لیکن تاریخ کے موضوع پر ان گنت کتابیں انگریزی اور اردو میں لکھی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک تو حسن ریاض صاحب کی کتاب تھی "پاکستان ناگزیر تھا" بقیہ سب کی سب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی تصانیف تھیں۔ میں موصوف کو ایک ڈرامہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے پہلے سے جانتا تھا "جامعہ" دہلی میں ان کی کچھ نگارشات بھی دیکھی تھیں۔ لیکن اب کے میرے سامنے برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ، تحریک پاکستان کی روداد اور جدوجہد آزادی کا کارنامۂ عظیم قریشی صاحب کی تحریروں میں سمٹا نظر آیا۔ میں نے ان کی یہ ساری کتابیں حرف بہ حرف پڑھیں۔ میں نے ایف اے نالندہ کالج، بہار سے کیا تھا۔ تاریخ میرا مضمون تھا، میرے تاریخ کے استاد الیشوری پرشاد نے کچھ اس طرح کے لیکچر دماغ میں ٹھونسے تھے کہ ملّی تاریخ کا سارا تار و پود ہی بکھر کر رہ گیا تھا۔ لیکن اب ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کی وساطت سے ذہن پر پڑے ہوئے جالے صاف ہو رہے تھے۔ دو قومی نظریے کا اصول سچا دکھائی دے رہا تھا۔ مسلم لیگ کی تحریک احیائے اسلام کی مؤید و محرک نظر آرہی تھی۔ قائد اعظمؒ کی قیادت اسلامیان ہند کی حیات جاوداں کا مظہر معلوم ہو رہی تھی۔ قریشی صاحب کی کتابیں پڑھتا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا کہ اگر خدانخواستہ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو ہم آج کہاں ہوتے؟ ہمارے ہونے کی تصدیق اور اس کے اسباب و عوامل پر پہلی مرتبہ ٹھوس دلائل سامنے آگئے۔ پھر میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ایک انجان شاگرد بن گیا۔

مذکورہ شعبے پر میرا مضمون خاصا طویل ہوگیا تھا، لیکن ماہنامہ "کتاب" کے اس وقت کے مدیر سید قاسم محمود صاحب نے اسے جوں کے توں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ جب مضمون چھپ گیا تو اس شعبے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور میرے عزیز دوست شمس ضحیٰ مرحوم نے مشورہ دیا کہ اس کا تراشا وائس چانسلر کی خدمت میں بھیج دوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

جب میرے خط کا جواب موصول نہیں ہوا تو دل کو دھچکا سا لگا۔ کہیں استاد و شاگرد کے انجانے رشتے ٹوٹ نہ جائیں۔ کہیں عقیدت و احترام کے موتی بے توجہی کے تیشے سے چکنا چور نہ ہو جائیں۔ لہٰذا میں نے ایک اور خط لکھ مارا جس میں گستاخی کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ مگر جب جواب موصول ہوا تو میں سخت شرمندہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف اپنی مصروفیات کی وجہ سے جواب نہ دے سکے تھے بلکہ اس کثرتِ کار نے انہیں اس قدر پریشان کیا تھا کہ تعمیری کام کا موقع بھی انہیں نہیں مل پاتا تھا۔ یہ جواب پاکر دل میں قائم شدہ سارے گلے شکوے جاتے رہے، بلکہ یہ خیال رہ رہ کر ستاتا رہا کہ ان کی مصروفیات کا تو لحاظ ہونا چاہیئے تھا، ان کے کارِ منصبی پر بھی تو غور کیا ہوتا۔ کسی دانش گاہ کو اپنے خون سے رنگ و نور عطا کرنے کی تیشہ گری میں اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ ہر کس و ناکس کے خط کا جواب بھی دیا جائے۔ مگر جواب آیا اور کیسی اثر پذیری لئے ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کی جو ایک جھلک سن ۶۲ میں دیکھی تھی، اس کے بعد انہیں دیکھنے کا مدتوں موقع نہ ملا۔ گفتگو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ غالباً ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ جناب نعیم صدیقی رسالہ "سیارہ" لاہور کا عبدالعزیز خالد نمبر نکال رہے تھے۔ خالد صاحب سے میری قلبی دوستی کو تاڑتے ہوئے موصوف نے مجھے اس نمبر کا مقامی ایڈیٹر نامزد کر دیا اور یہ طے پایا کہ میں خالد صاحب کی شخصیت اور فن پر مختلف ادیبوں سے نہ صرف مضامین لکھواؤں بلکہ نامور حضرات سے پیغام بھی حاصل کروں۔ ان میں جوش، فیض، اے بی اے حلیم، کرنل خواجہ عبدالرشید، ڈاکٹر محمود حسین وغیرہم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر قریشی کا بھی نام شامل تھا۔ چنانچہ موصوف سے فون پر وقت لے کر "زیبا منظر" جا پہنچا۔ وہ اس وقت اپنی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ میں خالد صاحب کی تصانیف کا بھاری پلندا سنبھالے، ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ گرمی شباب پر تھی۔ باہر کراچی کی جھلسا دینے والی ہوا چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے سرو قد کھڑے ہو کر مجھ ہیچمداں کا استقبال کیا اور انتہائی شفقت سے پاس والی کرسی پر بٹھایا۔ خیریت دریافت کی اور نوکر کو آواز دے کر ٹھنڈا پانی منگوایا۔ یہ سارے عوامل تین چار منٹ پر محیط تھے، لیکن ان کے اندر عنایت و شفقت کا جو وسیع سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، اسے محسوس کرنے کے لئے دلِ بینا ہی چاہیئے۔

اس گرم دوپہر میں میری برسوں کی پرانی حسرت برف کی طرح پگھل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب علم و عرفان کا سینہ وا کئے مجھ پر سب کچھ نچھاور کر رہے تھے۔ تاریخ، فلسفہ، ادب، مذہب کیا کچھ نہ تھا۔ میں ہمہ گوش، ان کے پہلو میں بیٹھا عرفان و آگہی کے موتی رول رہا تھا، اور جب اٹھا تو ان کے اس وعدے کے ساتھ کہ وہ "عبدالعزیز خالد نمبر" کے لئے اپنا پیغام جلد ہی مجھے بھیج دیں گے۔

اس یادگار ملاقات کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب سے کسی ادبی تقریب میں ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگے" اخبار میں مُش صحیٰ مرحوم پر تمہارا مضمون پڑھا تھا۔ تم نے ان کی شخصیت اور شاعری کا احاطہ نہایت فنکارانہ طور پر کیا ہے۔" ایسی ہمت افزا باتیں وہی شخص کرسکتا ہے جو ایک چھتنار درخت کی مانند اپنا سایہ یگانہ و بیگانہ پر یکساں ڈال رہا ہو۔

ڈاکٹر صاحب سے پھر ملاقات کا موقع مدتوں نہ ملا، نہ ہی ان سے گفتگو ہوئی اور نہ اس چھتنار درخت سے خوشہ چینی کا لمحہ میسر ہوا۔ اتفاق سے ۱۹۷۷ء کے وسط میں ایک ایسی بات سامنے آگئی کہ ڈاکٹر صاحب سے ملنا ناگزیر ہوگیا۔ اور ان سے میری یہ ملاقات آخری تھی اور عجیب و غریب نوعیت کی! ہوا یوں کہ دو سال پہلے ایک صاحب نیشنل بک فاؤنڈیشن میں میرے پاس آئے تھے اور اپنا ایک مسوّدہ اشاعت کے لئے دے گئے تھے۔ یہ تحریک پاکستان سے متعلق تھا جانچ پڑتال کے بعد اسے ناقابل اشاعت سمجھا گیا اور مسوّدہ انہیں معذرت کے ساتھ واپس لوٹا دیا گیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مذکورہ سال کے وسط میں ان صاحب نے اعلیٰ حکام کے پاس یہ شکایت نامہ بھیجا کہ فاؤنڈیشن ایک نااہل ادارہ ہے۔ لکھنے والوں کی پذیرائی نہیں کرتا۔ افسران مفت کی تنخواہیں لیتے ہیں، حتّٰی کہ ان کی کتاب بھی واپس کردی گئی جس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے عالم و فاضل کا تعارف شامل ہے۔

جب اس شکایت نامے کی نقل مجھے ملی تو میں چکرا گیا۔ اس لئے نہیں کہ مسوّدہ واپس کیوں کردیا گیا تھا۔ ناقابل اشاعت مسودے تو واپس ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تعجب اس امر پہ تھا کہ جب دو سال قبل یہ مسوّدہ آیا تھا تو اس میں ڈاکٹر صاحب کی تعارف نام کی کوئی ایک سطر بھی شامل نہ تھی۔ اب یہ کیا ماجرا ہے۔ لہٰذا میں نے فوراً ہی زیبا منظر فون کیا اور ڈاکٹر صاحب کو ساری حقیقت سے آگاہ کیا۔ کہنے لگے۔ ابھی آجاؤ۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو پوچھ بیٹھے کہ مصنف کا نام کیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا۔ بولے:

"لاحول ولاقوۃ: میں نے تو انہیں کوئی اور سمجھا تھا۔"

پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ "وہ صاحب گزشتہ مہینے میرے پاس آئے تھے۔ مسودہ تھمایا اور تعارف لکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس غلط فہمی میں رہا کہ یہ "بس" وہ" صاحب ہیں جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور تاریخ پاکستان پر جنھوں نے اچھا خاصا کام کیا ہے۔ میں انہیں دہلی سے جانتا ہوں۔ ضعیفی نے اتنا موقع نہ دیا کہ نام کے خفیف سے فرق کو محسوس کرتا۔ چنانچہ مسوّدہ رکھ لیا اور وعدہ کرلیا کہ تعارف لکھ دوں گا۔ اب تمہیں معلوم ہی ہے کہ نہ وہ قویٰ ہیں، نہ وقت ہے نہ سکون۔ میں تو ان صاحب کو اپنی دانست میں "وہ" سمجھ رہا تھا، لہٰذا مسوّدے کی جانچ پڑتال کی ضرورت محسوس کئے بغیر ایک مختصر سا تعارف لکھ دیا۔ اب تم سے معلوم ہوا کہ یہ تو کوئی اور ہی شخص نکلے۔" اور پھر ڈاکٹر صاحب مسکرانے لگے۔

میں نے کہا: ''قبلہ! میرا کیا ہوگا۔ میری تو نوکری خطرے میں پڑ گئی ہے۔ آپ کے تعارف ہی نے انہیں اعلیٰ حکام تک شکایت پہنچانے کا جواز بخشا ہے۔ میری گلو خلاصی کیسے ہوگی''

یہ سن کر کہنے لگے: ''جواب میں میری طرف سے غالبؔ کا یہ شعر لکھ دو اور بس۔ ۔ ۔ ۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے''

مجھے یہ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے بتائے ہوئے غالبؔ کے اس شعر نے معاملے کو رفع دفع کیا یا ان کے نام و شخصیت کے جادو نے!۔ بہر حال میری گلو خلاصی ہوگئی۔

افسوس کہ ایسی مشفق و مہربان شخصیت اسی اسلام آباد میں خالقِ حقیقی سے جا ملی اور میں ایسا بدنصیب کہ آوارۂ شہر ہو کر بھی ان کا آخری دیدار نہ کر سکا اور نہ ہی ان کی میت کو کاندھا دے سکا۔